جرم وسزا عہدِ سلطنت میں*

شریعت کی روشنی میں ایک جائزہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت جسے "عہد وسطیٰ کا ہندوستان" کہا جاتا ہے دو بڑے حصوں (عہد سلطنت - ۱۲۰۶ — ۱۵۲۶ء اور عہد مغلیہ - ۱۵۲۶-۱۸۵۷ء) پر مشتمل ہے۔ یہ دور محض سیاست وحکومت اور فوجی مہمات وفتوحات کے اعتبار ہی سے اہمیت نہیں رکھتا بلکہ مذہب وثقافت، علم وفن اور زبان وادب کے باب میں بھی اس دور کی خدمات بڑی اہم رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان خدمات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور جدید مورخین ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر کم توجہ دیتے ہیں۔ یہ بات معروف ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت بادشاہی نظام پر قائم تھی جو اصولی طور پر اسلامی نظام حکومت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ حکمرانوں کی زندگی اور دربار کے ماحول میں ایرانی روایات کی چھاپ پائی جاتی تھی اور نظم حکومت میں تیموری طرزِ حکمرانی کے واضح اثرات موجود تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ حکمراں مسلم تھے۔ ان کی حکومت کے اصول وضوابط اور نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں مسلم حکومتوں کے جو اثرات ونمونے ملتے ہیں وہ کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

برصغیر میں مسلم حکومت کا اولین حصہ یعنی عہد سلطنت تقریباً تین سو برس کے عرصہ پر محیط ہے شمالی ہندوستان یا اس ملک کے ایک بڑے حصہ میں مسلم حکومت کے قیام وانصرام کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ مختلف پہلوؤں سے اس کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں حکومت کا مذہب وشریعت سے کیا تعلق رہا ہے۔ یہ بھی ایک

* زیر اشاعت کتاب "سلاطین دہلی اور شریعت اسلامیہ" کا ایک باب

اہم مسئلہ ہے۔ اس کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف جرائم کی سزاؤں کے بارے میں سلاطین کا کیا رویہ رہا ہے؟ یہ مسئلہ اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق مظلوم کی دادرسی، مخالفوں اور حریفوں سے نبرد آزمائی اور عدل و انصاف کے قیام سے ہے۔ اس کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ سیاسی مجرمین یا مخالفوں اور باغیوں کو سزا دینے میں وہ کیا طریق کار اپناتے تھے؟ یہاں یہ واضح رہے کہ انتظامی امور میں شریعت کی اتباع سے متعلق سلاطین کی کوئی متعین پالیسی نہیں ملتی۔ بعض معاملات میں شریعت کی پابندی کی مثالیں سامنے آتی ہیں تو بعض میں اس کی خلاف ورزی نظر آتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ سزاؤں کا بھی ہے۔ اس دور میں مختلف جرائم کے لیے کیا سزائیں دی جاتی تھیں اس کا مطالعہ ایک تو قاضیوں کے فیصلوں کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے، دوسرے جرائم کے ان معاملات کے سیاق میں جنھیں سلاطین علماء کے مشورے سے طے کرتے تھے۔ تیسرے وہ سزائیں جن کے بارے میں سلاطین خود فیصلہ لیتے تھے۔ قاضیوں کے فیصلے کے ریکارڈ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پہلی نوع کا مطالعہ ممکن نہیں۔ اس لیے ذیل کی سطور میں جو کچھ پیش کیا جائے گا وہ اصلاً دوسرے اور تیسرے پہلو سے مطالعہ پر ہی مبنی ہوگا۔

سلاطین دہلی ظلم و ستم کے استیصال اور عدل و انصاف کے قیام پر خاص زور دیتے تھے۔ وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ مجرمین کو قرار واقعی سزا دینے میں وہ ذرا بھی نہیں ہچکچاتے خواہ وہ ان کے قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ عدل و انصاف کے قیام کو حکمراں کی بنیادی ذمہ داری تصور کرتے تھے۔ فخر مدبر کے بیان کے مطابق سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ـــ ۱۲۱۰ء) نے عدل و انصاف کا ایسا بہترین نظام قائم کیا تھا اور ظلم و زیادتی کرنے والوں سے اس قدر سختی سے پیش آتا تھا کہ کسی لشکری کو بھی اس بات کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ کسی آبادی سے کوئی پرندہ پکڑ لے یا کسی کے مکان پر زبردستی قیام کرے[۱] مزید براں مجرموں کو سزا دینے میں سلطان کے سخت رویہ کا اثر یہ ہوا کہ چور اور چوری کا ذکر ہی بالکل ختم ہوگیا (ذکر دزد و دزدی کہ برالسنۂ سائر بود در خاک افتاد[۲]) مظلوم کی دادرسی اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے سلطان التمش (۱۲۱۰-۱۲۳۵ء) کس درجہ حساس تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے یہ ہدایت

دے رکھی تھی کہ مظلوم یا ستم رسیدہ مخصوص قسم کا رنگین لباس پہنیں، جب وہ دربار میں یا سواری سے چلتے ہوئے کسی کو اس لباس میں دیکھتے تو فوراً اس کے معاملہ میں تفتیش کرتے اور ظالم سے اس کا انصاف دلاتے، پھر سلطان نے اس مسئلہ پر مزید غور کیا تو انھیں خیال آیا کہ اگر کوئی شخص رات میں کسی کے ظلم کا شکار ہوا اور ہم اسی وقت اسے انصاف دلانا چاہیں تو اس کی فریاد ہم تک کیسے پہنچے گی؟ کافی غور وفکر کے بعد اس کا یہ انتظام کیا کہ پتھر کے دو شیر بنوا کر اپنے محل کے دو برجوں پر رکھوادئے ان کی گردن میں لوہے کی دو زنجیریں ڈال کر ان میں ایک بڑی گھنٹی باندھ دی گئی اور اعلان کر دیا گیا کہ رات میں کوئی کسی کے ظلم کا شکار ہو تو وہ اس کے محل کے دروازہ پر آئے اس زنجیر کو ہلائے تاکہ بادشاہ ان کی آواز سن کر اسی وقت دادرسی کرسکے[۳۵]۔ ظالموں ومجرموں کو سزا دینے میں سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶—۱۲۸۷ء) کی اصول پسندی کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کا کوئی قریبی عزیز ومصاحب بھی کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کرتا تو اسے بھی نہیں بخشتے اور کسی مجرم کو سزا دیتے وقت یہ نہیں سوچتے تھے کہ وہ ان کے اقرباء میں سے ہے یا اعوان و انصار میں سے[۳۶] سلطان جلال الدین خلجی (۱۲۹۰—۱۲۹۵ء) صرف انہی جرائم میں سزائے موت کو جائز تصور کرتے تھے جو شریعت سے ثابت ہیں۔ قاتل، زانی (محصن) ومرتد کے علاوہ اور کسی کو یہ سزا دینا انھیں گوارا نہ تھا[۳۷] سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کا یہ کہنا تھا کہ کوئی شخص شراب خوری، چوری یا زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو ذاتی طور پر انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن اس معاملہ میں وہ مجرمین کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جو پیغمبرؐ کا حکم ہے[۳۸] ضیاء الدین برنی نے سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰-۱۳۲۵ء) کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا دینے میں ذرا بھی رعایت سے کام نہیں لیتے جو علانیہ طور پر احکام شرعی کی خلاف ورزی کرتے ہیں[۳۹] سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) نے عدل وانصاف کے اصولوں کا کس درجہ پاس ولحاظ رکھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ مشہور سیاح ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق جب ایک ہندو نے قاضی کی عدالت میں سلطان کے خلاف قتل کا مقدمہ دائر کیا تو وہ بلا چوں چرا قاضی کی عدالت میں ایک عام ملزم کی طرح حاضر ہوئے اور قاضی نے جو فیصلہ سنایا اسے بخوشی قبول کیا[۴۰] اسی طرح ایک دفعہ ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ

سلطان پر اس کا کچھ مالی حق ہے اور دونوں قاضی کے سامنے ایک دوسرے کے مقابل بن کر حاضر ہوئے۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ سلطان کے ذمہ مدعی کی رقم واجب الادا ہے سلطان نے اسے قبول کرتے ہوئے ادائیگی کی[۵۹] سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱۔ ۱۳۸۸ء) عدل وانصاف کے تقاضے پورا کرنے پر خاص زور دیتے تھے اور مجرمین کو سزا دینے میں اپنے اور بیگانے میں کوئی تفریق روا نہ رکھتے۔ اسی کے ساتھ وہ سزائیں دینے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے اور اس سلسلہ میں شرعی حدود کا پاس و لحاظ رکھتے[۶۰] ان سب امور کے ساتھ سلطان فیروز شاہ نے تفتیشِ جرم اور سزا کے ان تمام غیر شرعی طریقوں پر بھی پابندی عائد کی جو پہلے سے رائج تھے اور حکام کو صاف صاف ہدایت کی کہ وہ سزا کے باب میں احتیاط سے کام لیں اور انسانی جان کا احترام اور انسانی قدروں کی رعایت ملحوظ رکھیں[۶۱]۔ غالباً اسی احتیاط کو نرمی سے تعبیر کرتے ہوئے بعض جدید مورخین نے یہ تاثر دیا ہے کہ فیروز شاہ عام طور پر مجرمین کو معاف کر دیتے تھے[۶۲] لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

اس بات کے قطعی شواہد دستیاب ہیں کہ سلاطین دہلی سماجی و معاشی زندگی اور انتظامی امور سے متعلق علماء وقت سے تبادلہ خیال کرتے اور اہم مسائل کی بابت فقہی نقطہ نظر معلوم کرتے، معاصر مورخین کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرم و سزا کے باب میں بھی ان کی یہ روایت قائم رہی۔ خاص طور سے سنگین جرائم کی سزا کے بارے میں وہ علماء سے مشورہ طلب کرتے اور بعض اوقات ان کی اجتماعی رائے معلوم کرنے کے لیے مخصوص مجالس منعقد کراتے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے قاضی مغیث سے اپنی تفصیلی گفتگو کے دوران دیگر مسائل کے ساتھ یہ بھی دریافت کیا تھا کہ شریعت کی رو سے رشوت خور و بددیانت افسران کو کیا سزا دی جانی چاہیے؟ اس کے جواب میں قاضی مغیث نے یہ واضح کیا تھا کہ رشوت خوری و مالی بددیانتی کی کوئی سزا متعین نہیں ہے۔ حکمراں اپنی صوابدید کے مطابق (تعزیر کے تحت) جو سزا چاہے دے سکتا ہے۔ اسی ضمن میں قاضی نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ محکمۂ مالیات کے کسی افسر کو اگر بقدر کفایت تنخواہ نہ ملتی ہو اور وہ بیت المال سے کچھ چرا لے یا اس کی آمدنی میں خرد برد کرے تو اس پر حدِ سرقہ

جاری نہ ہوگی، بلکہ کوئی اور سزا دی جائے گی[۱۲] سلطان محمد بن تغلق درشت مزاجی وسخت روی کے لیے مشہور تھے لیکن سزائے موت کے مقدمات میں فیصلہ سے قبل دربار کے مفتیوں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے[۱۳] سزاؤں کے بارے میں ضیاء الدین برنی سے محمد بن تغلق کا طویل مکالمہ کافی مشہور ہے۔ سلطان نے خاص طور سے یہ جاننا چاہا تھا کہ قدیم ایرانی بادشاہ کن کن جرائم میں سزائے موت دیتے تھے اور ان میں سے کون سی سزائیں شریعت کے مطابق تھیں، تعجب ہے کہ سلطان نے مسلم حکمرانوں کے بجائے ایران کے قدیم بادشاہوں کا طرزِ عمل دریافت کیا۔ ضیاء الدین برنی نے اس باب میں جمشید اور دیگر ایرانی بادشاہوں کے زمانہ کے حالات بیان کرنے کے بعد یہ واضح کیا تھا کہ شریعت کی رو سے قتل، زنا وارتداد کے جرم میں سزائے موت دی جاسکتی ہے[۱۴] سیاسی وانتظامی امور میں علماء سے صلاح ومشورہ کے لیے سلطان فیروز شاہ سب سے زیادہ معروف رہے ہیں، سزاؤں کے سلسلہ میں بھی ان کا یہ پسندیدہ طرزِ عمل جاری رہا، وہ ان مجرمین کے معاملات میں فیصلہ کرنے سے قبل علماء کی رائے معلوم کرنی ضروری سمجھتے تھے جن کے جرائم سنگین نوعیت کے ہوتے اور جو سخت سزا کے مستحق قرار پائے۔ گمراہی پھیلانے والے بعض گروہوں، فسادِ عقیدہ کا سبب بننے والے کچھ صوفیاء، مہدی آخر الزماں اور نبوت کے بعض جھوٹے دعوے داروں، کفر و شرک کی علانیہ تبلیغ کا اڈہ قائم کرنے اور ارتداد کو ہوا دینے والے کچھ ہندوؤں کو سزا دیتے وقت سلطان نے خاص طور سے علماء سے استفسار کیا تھا[۱۵]

جہاں تک عہد سلطنت میں مختلف جرائم کے ارتکاب پر دی جانے والی سزاؤں کا تعلق ہے جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، اس سلسلہ میں بہت کم مواد دستیاب ہے۔ بہرحال جو کچھ تفصیلات مل سکتی ہیں انہی کی روشنی میں سزاؤں سے متعلق سلاطینِ دہلی کے طرزِ عمل کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جیسا کہ بخوبی معلوم ہے کہ شریعت میں شراب نوشی کی متعین سزا (حد) ۸۰ کوڑے ہے۔ دہلی سلطنت میں اس سزا کے نفاذ کی بعض مثالوں کے علاوہ شراب نوشی کی سزا کے طور پر قید، جلاوطنی اور ضبطِ اموال کا ذکر بھی ملتا ہے سلاطینِ دہلی میں سلطان علاء الدین خلجی نے خاص طور سے شراب نوشی کے انسداد میں دلچسپی لی،

اس کے لیے سخت قدم اٹھاتے ہوئے محکمہ احتساب کو چاق و چوبند بنایا اور جو لوگ اس کاروبار میں ملوث تھے ان پر نظر رکھنے کے لیے مخصوص عملہ مقرر کیا۔ مزید برآں ایسا کرنے والوں کو شہر بدر کرنے کی ہدایت جاری کی[۱۷]۔ جہاں تک شراب نوشی کی سزا کا تعلق ہے۔ سلطان نے اس جرم کے مرتکبین کے لیے مخصوص قید خانے بنوائے جو نہایت تنگ و تاریک ہوتے تھے۔ انھیں زدوکوب کرکے ان میں ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ وضاحت نہیں ملتی کہ کہ انھیں کتنے دنوں قید کی سزا دی جاتی تھی۔ البتہ برنی کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان تنگ و تاریک قید خانوں میں اتنی اذیت ہوتی تھی کہ بہت سے قیدی ان میں مر جاتے تھے اور جو زندہ بچ نکلتے ان کو صحت یابی میں کافی عرصہ لگ جاتا۔ دلچسپ بات یہ کہ شراب پینے والوں کے علاوہ بیچنے والوں کو بھی قید کی سزا دی جاتی تھی[۱۸]۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قاضی مغیث سے گفتگو کے دوران سلطان علاء الدین خلجی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ شراب نوشی کی وہی سزا دیتے ہیں جو حدیث سے ثابت ہے لیکن مذکورہ عمل سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے بھی شراب نوشی کی ممانعت کے احکام جاری کیے اور حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے سخت اقدام کیے جائیں[۱۹] لیکن یہ وضاحت نہیں ملتی کہ جو لوگ اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے انھیں کیا سزا دی جاتی تھی۔ سلطان محمد بن تغلق خود شراب نوشی سے اجتناب کرتے تھے اور امرا و حکام کو بھی اس برائی سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ صاحب مسالک الابصار کے بیان کے مطابق سلطان کے دربار میں نہ تو علانیہ کوئی شراب پی سکتا تھا اور نہ چھپ کر اور اگر کوئی اس جرم میں ملوث پایا جاتا تو وہ اس پر حد جاری کرتا تھا (ولا یتجاسر احد ان یظہر فی بلادہ بجرم و اشد ما ینکر علی الخمر ویقیم الحد فیہ، و یبالغ فی تادیبہ من یتعاطاہ من المقربین الیہ[۲۰]) مسالک الابصار کے اردو مترجم (پروفیسر خورشید احمد فارق) نے متعلقہ عبارت کے ترجمہ میں (اقامت حد کے بجائے) یہ صاف لکھ دیا ہے کہ وہ "شراب نوشی کی قانونی سزا اسی کوڑے دیتا ہے[۲۱]"۔ اسی سلطان کے عہد میں ایک سرکاری افسر کی پوری جائداد اسی جرم میں ضبط کر لی گئی کہ وہ شراب کا عادی تھا[۲۲]۔

شریعتِ اسلامی کی رو سے زنا کی متعین سزا غیر شادی شدہ کے لیے ۱۰۰ کوڑے

اور شادی شدہ کے لیے رجم یا سنگ ساری ہے۔ عہد زیر بحث میں زنا اور اس کی سزا کے حوالے بہت کم دستیاب ہیں۔ مشہور مورخ پروفیسر محمد حبیب نے فتاوای جہانداری کے انگریزی ترجمہ کے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عہد سلطنت میں زنا کے جرم میں کسی کو رجم کی سزا دیے جانے کا ذکر نہیں ملتا۔[۲۲] اس دور کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے یہ بیان کیا ہے کہ سلطان علاء الدین نے قاضی مغیث سے اپنی گفتگو کے دوران یہ واضح کیا تھا کہ وہ زنا کی وہی سزا دیتے ہیں جو حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن اسی سلطان سے متعلق برنی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اس کی یہ واضح ہدایت تھی کہ اگر کوئی شادی شدہ شخص اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی قوت مردانگی ختم کر دی جائے۔[۲۴]
ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کے عہد کے حوالہ سے یہ تحریر کیا ہے کہ شاہی خاندان کی ایک خاتون سے زنا کا ارتکاب ہوا اور اس نے خود اس کا اعتراف کیا تو قاضی کے فیصلے کے مطابق اسے سنگ سار کر دیا گیا۔[۲۵] نہ معلوم کس بنیاد پر ابن بطوطہ کے اردو مترجم (رئیس احمد جعفری ندوی) نے اس واقعہ کو غیر مصدقہ قرار دیا ہے۔[۲۶] محمد بن تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بعض دیہاتوں میں یہ قبیح رسم جاری تھی کہ ایک شخص دوسرے کی منکوحہ کو اس کے اصل شوہر کے طلاق دینے سے قبل اپنی بیوی بنا لیتا تھا۔ سلطان کو جب اس کا علم ہوا تو اسے انتہائی شنیع حرکت قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی اور حکام کو ہدایت کی کہ ایسے واقعات کی چھان بین کی جائے اور مجرمین کو قرار واقعی سزا دی جائے۔[۲۷] متعلقہ مآخذ سے یہ وضاحت نہیں ملتی کہ ایسے مجرمین کو کیا سزا دی گئی یا دی جاتی تھی؟ اگرچہ اصلاً یہ زنا کا معاملہ نہیں تھا لیکن ناجائز یا غیر قانونی طور پر کسی سے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی وجہ سے اس سے مشابہت رکھتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے معاصرین میں سلطان محمود شاہ بہمنی (۱۳۷۸–۱۳۹۷ء) گجرات میں حکمراں تھے۔ ان کے عہد میں زنا کے ارتکاب اور اس پر فیصلہ کا ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا، فرشتہ کے بیان کے مطابق سلطان محمود کے زمانۂ حکومت میں ایک عورت زنا کی مجرم قرار پائی۔ جب سزا کے نفاذ کے لیے اسے دارالقضاء میں حاضر کیا گیا۔ تو قاضی نے پوچھا کہ اسے کس چیز نے اس سنگین جرم کے ارتکاب پر آمادہ

کیا؟ اس عورت نے جواب دیا کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کام حرام ہے۔ اسے گمان تھا کہ جس طرح ایک مرد کے لیے چار عورتیں حلال ہیں اسی طرح ایک عورت کے لیے چار مردوں سے تعلقات جائز ہیں۔ اس اشتباہ کی وجہ سے وہ اس جرم کی مرتکب ہوئی۔ اب جب کہ اسے اس کی حرمت معلوم ہوگئی ہے وہ آئندہ اس کی جرأت نہ کرے گی۔ اس جواب کے بعد اس پر سزا کا نفاذ روک دیا گیا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرشتہ نے لکھا ہے۔ اس مکارہ و بدکارہ نے حیلہ بازی سے اپنے آپ کو حدِ شرعی سے بچا لیا۔[۲۸]

چوری کی سزا کے سلسلہ میں بھی دستیاب معلومات ناکافی ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ضرور یہ اعلان کیا تھا کہ وہ شریعت کے مطابق اس کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن معاصر مآخذ میں کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں مل سکا جس سے اس بیان کی تصدیق ہوسکے یا یہ معلوم ہو کہ اس زمانہ میں چوری کی سزا میں حدِ سرقہ جاری ہوئی تھی۔ قاضی مغیث سے سلطان کی بات چیت میں صرف بیت المال سے چوری کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا اور (جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے) قاضی نے یہ واضح کیا تھا کہ سلطان اس نوعیت کی چوری پر ضبطِ اموال، قید یا (تعزیر کے تحت) اور کوئی سزا دے سکتا ہے لیکن ایسے چور پر حدِ سرقہ نافذ نہ ہوگی۔[۲۹] پروفیسر محمد حبیب صاحب نے ذکر کیا ہے کہ عہدِ سلطنت میں چوری کے بہت سے واقعات پیش آئے جن میں مجرمین کو سزا دی گئی لیکن کسی بھی چور کے ہاتھ کاٹے جانے کا ذکر نہیں ملتا۔[۳۰] فاضل مورخ کے بیان سے یہ نہیں واضح ہوتا کہ ان معاملات میں چوروں کو کیا سزائیں دی گئیں۔

عہدِ سلطنت میں قتل سے متعلق متعدد واقعات ہیں قاتل کو سزائے موت دیے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ گرچہ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ کسی کو قتل کرنے یا جان سے مارنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اسی لحاظ سے اسلامی شریعت میں ان کی علیحدہ علیحدہ سزائیں متعین ہیں۔ اس کی سب سے معروف قسم قتل بالعمد یا قصداً کسی کو مار ڈالنا ہے۔ شریعت کی رو سے ایسے قتل کے مجرم کو قصاص میں قتل کیا جائے گا یا مقتول کے ورثہ کی جانب سے معافی کی صورت میں قاتل کی جاں بخشی ہوگی اور اسے صرف دیت یا خون بہا ادا کرنا ہوگا۔[۳۱]

قتل کی سزا کے ذیل میں سلاطین کے علماء سے استفسار اور اس کے نفاذ میں سختی برتنے کا ذکر مختلف مورخین کے یہاں ملتا ہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن علی الاعلان یہ کہتے تھے کہ وہ کسی بے گناہ کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ سلطان نے شہزادوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو مخاطب کرکے یہ فرمایا تھا کہ تم لوگوں کی قربت مجھے کسی مجرم کو سزا دینے سے نہیں روک سکتی۔[۳۲] سلطان محمد بن تغلق نے ان جرائم کے باب میں ضیاء الدین برنی سے استفسار کیا تھا جن کے ارتکاب پر شریعت میں سزائے موت مقرر ہے۔[۳۳] شمس سراج عفیف کے بیان کے مطابق سلطان فیروز شاہ تغلق قتل کے مجرموں کو سزا دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے، اگر چہ وہ حکومت کا اعلیٰ افسر ہی کیوں نہ ہو۔[۳۴] سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں قتل کی سزا کے نفاذ سے متعلق برنی نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ ملک بق بق سلطان کے بہت قریبی تھے اور سر جاندار (شاہی محافظین کے سردار) کے منصب پر فائز تھے۔ بدایوں میں انھیں جاگیر ملی ہوئی تھی، ہزاروں نوکر چاکر تھے۔ ایک روز مدہوشی کے عالم میں ایک فراش کو درّہ سے مار ڈالا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان بدایوں تشریف لے گئے۔ مقتول کی اہلیہ سلطان کے سامنے فریادی بن کر آئی اور اپنے شوہر کے قتل کا واقعہ بیان کیا، اسے سن کر سلطان نے حکم دیا کہ ملک بق بق کو مقتول کی اہلیہ کے سامنے درّہ سے مارا جائے یہاں تک کہ وہ اس کے زخم سے مر جائے مزید برآں سلطان کے حکم سے بدایوں کے برید (خفیہ رپورٹر) کو شہر کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا کہ اس نے اس واقعہ کی اطلاع نہ دی اور قاتل کے ساتھ رعایت کی۔[۳۵] سلطان بلبن کے زمانہ میں ہی حکومت کے ایک اہم افسر اور اودھ کے اقطاع دار ہیبت خاں نے ایک شخص کو مستی کی حالت میں قتل کر دیا۔ مقتول کی بیوی سلطان کے دربار میں داد خواہ ہوئی۔ سلطان نے اسے پانچ سو درّے لگوا کر اس عورت کے حوالے کر دیا اور کہا کہ آج تک یہ میرا غلام تھا۔ اب یہ تیرا غلام ہے۔ تو چاہے اسے قتل کر دے یا بخش دے، ہیبت خاں نے اس سے چھٹکارے کے لیے بہت سے لوگوں کا سہارا لیا۔ آخر نہایت گریہ وزاری کرتے ہوئے بیس ہزار ٹنکہ (چاندی کا سکہ) عورت کو دے کر گلو خلاصی حاصل کی۔[۳۶] سلطان محمد بن تغلق کے دور کا یہ واقعہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ جب سلطان کے خلاف ایک ہندو کے قتل کا جرم ثابت ہو گیا تو قاضی نے یہ فیصلہ سنایا کہ قصاص سے نجات کی یہی

صورت ہے کہ وہ مقتول کے ورثہ کو راضی کر لے اور دیت ادا کرے[۳۷] اسی عہد میں یوسف بغرا یوسف پور (غازی پور) کے جاگیر دار تھے وہ شاہی دربار میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ان کے دو سوتیلے لڑکے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی کے کچھ ہی دن بعد ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ مقتول کی ماں نے سلطان کی عدالت میں قاتل کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ سلطان کے حکم سے قاتل کو سزائے موت دی گئی۔[۳۸] اسی سلطان کے زمانہ میں ایک اور واقعہ اسی نوع کا پیش آیا اور اس میں قاتل کو سزائے موت دی گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شعبۂ مالیات کے ایک اہم افسر خواجہ احمد قتل کے الزام میں ماخوذ ہوئے اور ان کے خلاف جرم ثابت ہو گیا۔ سلطان نے انھیں قصاص میں قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا وہ کافی خوف زدہ ہوئے اور جاں بخشی کے لیے اسی ہزار ٹنکہ سلطان کی خدمت میں بطور دیت پیش کیا لیکن سلطان نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر دیت کی ادائیگی پر مالدار لوگوں کو معاف کیا جاتا رہا تو یہ لوگ دوسروں کو قتل کرتے رہیں گے۔ اس صورت میں مجھے یوم قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے میں بڑی شرمندگی ہوگی[۳۹] ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقتول لاوارث تھا اور سلطان کی حیثیت ولی کی تھی۔ اس لیے کہ مقتول کے ورثہ کی موجودگی میں سلطان یا کسی حکمراں کو دیت کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

قتل اور اس کی سزا کے مذکورہ واقعہ کی جو تفصیلات تاریخی مآخذ میں ملتی ہیں ان سے یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ قتل کے مقدمات کی پوری چھان بین کی جاتی تھی اور قطعی شواہد ملنے پر ہی کسی ملزم کو مجرم قرار دے کر سزا دی جاتی تھی۔ معاصر مورخ شمس سراج عفیف کے بیان کے مطابق خواجہ احمد نے ایک لڑکے (جو اُن کے بچوں کو پڑھاتا تھا) کو قتل کر کے رات میں اس کی لاش ایک پل پر پھینک دی۔ صبح کو جب سلطان کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے اس واقعہ کی تفتیش کا حکم دیا۔ تحقیقات کے بعد جب قاتل کا سراغ مل گیا تو اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ قتل کے اسباب کے سلسلے میں خواجہ احمد کے غلاموں اور کنیزوں سے سختی کے ساتھ پوچھ گچھ کی گئی تو انھوں نے سلطان کے سامنے حقائق واضح کر دیے اور قتل کا سبب یہ

بتایا کہ اس لڑکے کا ایک عورت سے ناجائز تعلق تھا۔ یہ بیان جرم کے اثبات کے لیے کافی تھا۔ لیکن سلطان اب بھی مطمئن نہیں تھے۔ دوسری جانب ملزم اپنے کو بے قصور کہہ رہا تھا اور قتل کے لیے غلاموں کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ غلاموں نے اپنے دفاع میں ثبوت کے طور پر اس خون آلود کپڑے کا حوالہ دیا جسے دھونے کے لیے خواجہ احمد نے دھوبی کو دیا تھا۔ سلطان نے دھوبی کو متعلقہ کپڑے کے ساتھ دربار میں طلب کیا۔ دیکھا گیا تو اس پر پیلے دھبے پائے گئے۔ خواجہ احمد سے جب اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ اس جانور کے خون کا نشان ہے جسے انھوں نے اسی روز ذبح کیا تھا۔ سلطان کو اس جواب سے تشفی نہ ہوئی اس نے دربار میں قصابوں کو طلب کیا اور خون کے نشان کے بارے میں معلوم کیا۔ انھوں نے خواجہ احمد کے بیان کی تردید کی اور یہ واضح کیا کہ کپڑے پر پیلے دھبے انسانی خون کے دھونے کے بعد ہی پڑتے ہیں۔ ان شواہد کی روشنی میں خواجہ احمد کے خلاف جرم ثابت ہو گیا اور انھیں سلطان کے حکم کے مطابق سزائے موت دی گئی[۴۰]

جہاں تک مالی بدعنوانی، رشوت ستانی اور اس کی سزا کا تعلق ہے اس سلسلہ میں سلطان علاءالدین خلجی کے استفسار کے جواب میں قاضی مغیث نے یہ واضح کیا تھا کہ شریعت میں اس کی کوئی متعین سزا نہیں ہے اور یہ مسئلہ اصلاً تعزیر کے تحت آتا ہے جس میں سلطان جرم کی نوعیت دیکھتے ہوئے کوئی مناسب سزا طے کر سکتا ہے۔ بیت المال یا سرکاری خزانہ میں خرد برد کی بابت بھی انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ حکمراں اپنی صوابدید کے مطابق مالی جرمانہ، قید یا اور کوئی سزا متعین کر سکتا ہے[۴۱] حکومت کے متعینہ محاصل کے علاوہ دوسرے محصول وصول کرنا یا مقررہ شرح سے زیادہ لینا اور پھر محصّل کا اسے اپنے تصرف میں لانا بھی مالی بدعنوانی کے زمرہ میں آتا ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے نہ صرف یہ کہ تمام غیر شرعی محاصل کے خاتمہ کا اعلان کیا بلکہ یہ حکم بھی صادر فرمایا کہ شعبۂ محاصل کا جو بھی ملازم یا افسر حکومت کے متعینہ محاصل یا کسی محصول کی مقررہ شرح سے زیادہ وصول کرے گا وہ سخت سزا سے دوچار ہوگا[۴۲] اگرچہ یہ وضاحت نہیں ملتی کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کیا سزا دی جاتی تھی لیکن بعض مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں مالی بددیانتی کی عام سزا ضبط اموال و

جلاوطنی تھی۔ فیروز شاہ کے عہد میں سرکاری خزانہ کے ایک افسر شمس الدین ابو رجا پر محاصل کی آمدنی میں خرد برد کرنے کا الزام لگایا گیا تو دیوان وزارت کے تحت ان پر کھلے عام مقدمہ چلا جب ان کے خلاف جرم ثابت ہوگیا تو سلطان نے یہ حکم صادر فرمایا کہ ان کی جائداد ضبط کرلی جائے اور انھیں شہر بدر کردیا جائے[۳۴] اسی سلطان کے عہد میں مہوبہ (بندیلکھنڈ ڈویژن کا ایک تاریخی مقام جواب یوپی کا ایک نیا ضلع بن گیا ہے) کے گورنر قاضی صدرالملک سرکاری خزانہ کے پچاس لاکھ روپیے کے ناجائز استعمال کے مجرم قرار پائے تو سلطان کے حکم سے انھیں سزائے موت دی گئی[۳۵] سرکاری مال میں خیانت کی یہ سزا بہت سخت معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ واضح کیا گیا اسلامی شریعت میں اس نوع کے جرم کی سزا متعین نہیں ہے اور یہ معاملہ تعزیر کے تحت آتا ہے جس میں سزا کا تعین سربراہ حکومت یا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے۔ مالی بدعنوانی کا مذکورہ واقعہ ایک ایسے سرکاری افسر سے تعلق رکھتا تھا جو بہت ہی اہم ذمہ داری انجام دے رہا تھا۔ غالبًا اسی لیے انھیں سخت ترین سزا دی گئی۔ اس واقعہ کے ضمن میں خود مورخ عفیف نے لکھا ہے کہ فیروز شاہ کے زمانہ میں کسی سرکاری افسر کو (بدعنوانی کے جرم میں) سزائے موت دینے کا پہلا واقعہ ہے[۳۶]

زیر بحث موضوع سے متعلق یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ سلاطین دہلی ان لوگوں کو کیا سزا دیتے تھے جو بددینی و گمرہی پھیلاتے تھے، عوام کی اخلاقی زندگی میں بگاڑ پیدا کرتے تھے اور علانیہ کفر و شرک کی تبلیغ کرکے فتنۂ ارتداد کو ہوا دیتے تھے۔ عہد سلطنت میں اس نوع کے مختلف واقعات پیش آئے۔ اپنے خیالات و طرز عمل سے عقاید میں فساد پیدا کرنے والے بعض اشخاص کے علاوہ لوگوں کی دینی و اخلاقی زندگی تباہ کرنے والے کچھ فرقے بھی نمودار ہوئے۔ ان لوگوں کے سلسلے میں سلاطین نے انتہائی سخت رویہ اختیار کیا اور ان مجرمین کے لیے زیادہ تر سزائے موت کا فیصلہ صادر فرمایا سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں اباحتیوں کا فرقہ نمودار ہوا۔ اس سے تعلق رکھنے والے لوگ کھلے عام محرمات و منکرات میں ملوث ہوتے، مشرکانہ رسوم و روایات اختیار کرتے، بالخصوص عورتوں سے ارتباط و اختلاط میں بے شرمی کا مظاہرہ کرتے۔ اس معاملہ میں وہ شرعی حدود و قیود کا بالکل خیال نہ رکھتے تھے۔ وہ ایسے طرز زندگی

کے داعی تھے جس میں اخلاقی اصول وضوابط کا کوئی پاس ولحاظ نہ تھا۔ سلطان نے اس فرقہ کے لوگوں کو تلاش کرا کے دربار میں طلب کیا اور ان کے حالات وطریقۂ زندگی کی تفتیش کے بعد ان سب کو قتل کرا دیا۔[۱۱] جدید مورخین میں اباحتی فرقہ کی اصلیت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے اسے قرامطہ واسمٰعیلی فرقوں سے منسوب کیا ہے جب کہ بعض کے خیال میں یہ ہندوؤں کے وام مارگی فرقہ کا ایک حصہ تھا۔[۱۲]

سلطان فیروز شاہ تغلق مذہبی وسماجی زندگی کی اصلاح میں دلچسپی کے لیے کافی مشہور ہیں۔ انھوں نے صالح افکار ونظریات کی پرورش پر خاص توجہ دی۔ ان تمام لوگوں، گروہوں اور فرقوں کے خلاف انھوں نے علماء کے مشورہ سے سخت قدم اٹھائے جو اباحتی طرز زندگی کی دعوت اور ملحدانہ نظریات کی تبلیغ میں مصروف تھے۔ انھوں نے صوبہ کے اعلیٰ حکام کے نام یہ واضح ہدایت جاری کی کہ وہ تمام گروہ جو شریعت کے حدود سے تجاوز کریں اور ایسے کام کریں جن کی مذہب میں اجازت نہیں ہے انھیں پوری سختی سے ان چیزوں سے باز رکھا جائے۔[۴۷] سلطان فیروز شاہ کے زمانہ میں اباحت پسندوں کا ایک گروہ دہلی میں پھر سرگرم ہوا۔ "فتوحات فیروز شاہی" کی تفصیلات کے مطابق اس گروہ کے لوگ جن میں مرد وعورت دونوں شامل تھے، رات میں ایک خاص مقام پر جمع ہوتے۔ کھانے پینے کے علاوہ شراب کا دور بھی چلتا۔ اس کے بعد مختلف قسم کی کھلی ہوئی برائیوں میں ملوث ہوتے۔ مزید برآں یہ لوگ جن کو اپنا ہم نوا بناتے انھیں ایک تصویر کے سامنے سجدہ کراتے اور طرح طرح کی غیر اخلاقی حرکتوں کی ترغیب دیتے تھے۔ سلطان نے اس گروہ کے افراد کو ان کی سرگرمیوں کے لحاظ سے مختلف سزائیں دیں۔ اس کے لیڈروں کو قتل کرا دیا۔ بعض افراد کو قید میں ڈال دیا اور کچھ کو شہر بدر کر دیا۔[۴۸] اسی عہد میں رکن الدین نامی ایک شخص نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور "مہدی آخر الزماں" کا لقب اختیار کیا۔ اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ اسے "علم لدنی" حاصل ہے اور وہ تمام مخلوقات کے ناموں سے بخوبی واقف ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ لوگ اسے (نعوذ باللہ) پیغمبر تسلیم کریں۔ اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے رکن الدین نے ایک رسالہ بھی تحریر کیا تھا۔ سلطان کو جب ان سب باتوں کا پتہ چلا تو اسے دربار میں طلب کیا۔ دریافت کرنے پر جب اس نے مذکورہ

اعتقادات و نظریات کا اعتراف کیا تو علما نے انھیں مباح الدم قرار دیا اور مسلمانوں کو گمرہی سے بچانے کے لیے اس فتنہ کو دبانے پر زور دیا۔ اسی کے مطابق سلطان نے رکن الدین اور ان کے پیروؤں کو سزائے موت دی[۵۰]۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں ہی احمد بہاری نامی ایک شخص دہلی میں گمرہی پھیلا رہا تھا۔ اس نے اپنے گرد معتقدین کا ایک گروہ جمع کر رکھا تھا جو اسے (نعوذ باللہ) خدا کہتا تھا۔ اس کے بعض مریدین برملا یہ کہتے پھرتے تھے کہ دہلی میں خدا طلوع ہوا ہے اور اس سے وہ احمد بہاری کو مراد لیتے مزید برآں۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا بھی الزام تھا۔ اس گروہ کے باطل معتقدات اور ان کے مسموم اثرات کو محسوس کرتے ہوئے سلطان نے احمد بہاری اور اس کے خاص مرید کو قتل کرا دیا اور باقی معتقدین کو توبہ و انابت پر آمادہ کر کے مختلف مقامات پر منتشر کر دیا تاکہ ان کی قوت مجتمع نہ ہونے پائے[۵۱]۔ گرچہ فتوحاتِ فیروز شاہی (جس میں یہ ساری تفصیلات مذکور ہیں) سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ احمد بہاری تصوف کے کسی سلسلہ سے منسلک تھے، لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مناقب الاصفیاء (مؤلفہ شاہ شعیب فردوسی) کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ وہ نظریۂ وحدت الوجود کے قائل تھے، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے ان کا گہرا ربط تھا اور دونوں میں توحید کے اسرار و رموز پر گفتگو بھی ہوتی تھی[۵۲]۔ اسی دور میں گجرات میں بھی ایک صاحب فلسفۂ وحدت الوجود کی بے اعتدالی کا شکار ہوئے اور انھوں نے "انا الحق" کی صدائیں بلند کیں۔ یہ حکومتِ فیروز شاہی کے اہم افسر عین الملک ماہرو کے غلام تھے۔ انھوں نے گجرات میں اپنی صوفیت کا بازار گرم کر کے مریدین کی ایک جماعت تیار کر لی تھی وہ خود "انا الحق" کہتے اور مریدین "توئی توئی" کہہ کر اس کے دعوے پر مہر تصدیق ثبت کرتے تھے۔ یہ سب باتیں عوام میں گمرہی پھیلا رہی تھیں اور ان کے عقاید و نظریات میں فساد پیدا کر رہی تھیں سلطان نے علما کے مشورہ سے ان کو بھی سزائے موت سے دوچار کیا[۵۳]۔ سلطان فیروز شاہ نے شیعہ فرقہ کے ان لوگوں کو بھی سخت سزائیں دیں جو خلفاء راشدینؓ، حضرت عائشہؓ اور تمام بڑے بڑے صوفیاء کو علانیہ سب و شتم کا نشانہ بناتے تھے اور قرآن کریم کو "ملحقاتِ عثمانی" کہتے تھے، یہ لوگ دوسروں کو رافضیت کی دعوت دیتے تھے اور اپنے اعتقادات و افکار سے متعلق کتابیں اور رسائل لکھ کر

ان کی ترویج کرتے تھے۔ سلطان کے خود اپنے بیان کے مطابق ان روافض کو گرفتار کیا گیا اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمرہی میں مبتلا کر رہے ہیں تو ان میں جو غالی قسم کے تھے انھیں قتل کرادیا گیا اور باقی لوگوں کو تعزیر کے طور پر کچھ سزا دی گئی اور تہدید و تشہیر کے ذریعہ انھیں تنبیہ کی گئی مزید برآں ان کی کتابوں کو برسر عام جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔[۵۴]

اباحت پسندی، مہدویت و صوفیانہ افکار کی غلط تعبیر کے ساتھ ساتھ یہ دور فتنۂ ارتداد سے بھی دوچار ہوا، اس کے سدّباب کے لیے سلطان فیروز شاہ نے سخت سزا نافذ کی۔ سلطان کو معلوم ہوا کہ دہلی کے ایک قدیم حصہ میں ایک زنّار دار (برہمن) نے الحاد و بے دینی کی تعلیم کا ایک اڈہ قایم کر رکھا ہے اور لوگوں کو اکٹھا کرکے انھیں شرک و بت پرستی کی دعوت اور کافرانہ اعمال کی ترغیب دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ایک مسلمان عورت کو مرتد بنا دیا ہے۔ سلطان نے علماء سے استفسار کیا کہ اس برہمن کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہیے؟ علماء نے یہ رائے ظاہر کی کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو اس کی جاں بخشی ہوسکتی ہے لیکن اگر وہ اس سے انکار کرتا ہے تو وہ سزائے موت کا مستحق ہے۔ بار بار کی پیشکش کے باوجود جب وہ انکار کرتا رہا تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[۵۵] خود مرتدہ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ فقہ حنفی کی رو سے مرتدہ قتل نہ کی جائے گی بلکہ اسے قید میں رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے۔ البتہ دوسرے فقہاء کی رائے میں وہ بھی سزائے موت کی مستحق قرار پائے گی۔[۵۶] فیروز شاہ کے زمانہ ہی میں ایک اور شخص کو بعض علماء کی رائے کے مطابق مرتد قرار دے کر سزائے موت دی گئی اگرچہ بظاہر یہ ارتداد کا معاملہ نہیں نظر آتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملتان کے ممتاز عالم اور مشہور سہروردی صوفی سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں (م ۱۳۸۳ء) جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو قصبہ اوچھ کا ہندو داروغہ لواہوں ان کی عیادت کے لیے آیا اور اس موقع پر اس نے یہ الفاظ ادا کیے: "خدائے تعالیٰ حضرت مخدوم را صحت دہد۔ ذات پاک مخدوم ختم اولیاست چناں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ختم انبیاء بود"[۵۷] (خدائے تعالیٰ حضرت مخدوم کو صحت عطا فرمائے۔ مخدوم کی ذات

ختم الاولیا، ہے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ختم انبیاد تھے) ان کلمات کی بنیاد پر مخدوم جہانیاں اور ان کے بھائی شیخ صدرالدین نے نواہوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اسلام قبول کرنے کا صاف اعلان کرے جب وہ منکر ہوا تو اس پر ارتداد کا الزام لگایا گیا۔ وہ بھاگ کر دہلی چلا آیا اسی دوران مخدوم جہانیاں وفات پا گئے۔ کچھ دنوں کے بعد شیخ صدرالدین گواہوں کے ساتھ دہلی آئے اور نواہوں کو مرتد قرار دینے پر اصرار کیا۔ گرچہ بعض علماء بالخصوص قاضی عبدالمقتدر ان سے متفق نہیں تھے لیکن ان کا اصرار جاری رہا۔ آخر کار نواہوں کو ارتداد کے جرم میں قتل کرا دیا گیا[۵۸]

جہاں تک سیاسی جرائم، بالخصوص سلطان کی مخالفت، اس کی حکومت کے خلاف سازش و بغاوت اور ملک میں بدامنی و انتشار پیدا کرنے کی سزاؤں کا تعلق ہے، سلاطینِ دہلی اس باب میں نہایت سختی سے کام لیتے تھے اور اس نوع کے ادنیٰ سے ادنیٰ جرم پر سخت ترین سزا دینے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے۔ گرچہ ان جرائم کی سزا سے متعلق بھی وہ بعض اوقات علماء سے استفسار کرتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں وہ ان کی آراء پر بہت کم توجہ دیتے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تخت و تاج کے تحفظ یا سیاسی مفادات کی خاطر سیاسی مجرمین کو سزا دیتے وقت وہ شریعت کی حدود و قیود سے بالکل بے پروا ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی جرائم کی سزا دینے میں وہ بہت سے غیر شرعی طریقے اپناتے تھے۔ بعض سلاطین کے عہد میں جن مجرمین کو سزائے موت دیتے وقت زہر دینے، بلندی سے گرا دینے، پانی میں ڈبونے، ہاتھیوں کے پیروں کے نیچے کچلوانے جیسے غیر شرعی طریقے اپنائے جاتے تھے۔ ان کا تعلق زیادہ تر سیاسی مجرمین سے تھا[۵۹] اہم بات یہ کہ سیاسی مجرمین کو اذیت ناک سزائیں دینے میں سلاطین مسلم و غیر مسلم، اجنبی و قریبی، عام و خاص اور درباری و غیر درباری میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ سیاسی جرائم بالخصوص بغاوت کی سزا میں ایک بہت بڑی بے اعتدالی یہ جاری تھی کہ باغی کے ساتھ ساتھ اس کے پورے خاندان کو تہ تیغ کر دیا جاتا تھا۔ برنی نے اس رسمِ قبیح کو خاص طور سے سلطان علاءالدین خلجی کے زمانے سے منسوب

کیا ہے۔[66] اسی طرح بعض اوقات باغی سے ادنیٰ تعلق یا قربت کے اظہار کو سزائے موت کے موجب قرار دیا جاتا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں شیخ علی حیدری کو باغی کے ساتھ ساز باز کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جب کہ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انھوں نے بغاوت کے اصل مجرم قاضی جلال الدین افغانی کو عمامہ اپنے سر سے اتار کر دیا تھا اور ان کے لیے دعا کی تھی[67]۔ سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں سیدی مولا (جو بڑے عابد و زاہد تھے، درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور عوام و خواص میں کافی مقبولیت رکھتے تھے) کو بغاوت کے الزام میں بے رحمی سے مار ڈالا گیا۔ جب کہ اس واقعہ کی جو تفصیلات تاریخی مآخذ میں ملتی ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اصل مجرم قاضی جلال الدین کاشانی اور ان کے بعض رفقاء تھے جو سلطان سے ذاتی عناد رکھتے تھے۔ ان سب نے مل کر یہ سازش رچی کہ جب سلطان جمعہ کی نماز کے لیے نکلیں تو انھیں قتل کر دیا جائے اور ان کی جگہ سیدی مولا کو تخت دہلی پر بٹھا دیا جائے یہ بھی طے ہوا کہ شاہی خاندان سے سیدی مولا کا تعلق قائم کرنے کے لیے سلطان ناصر الدین کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی جائے۔ کس طرح یہ سازش بے نقاب ہوگئی اور جب سلطان جلال الدین خلجی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے سیدی مولا اور ان کے متوسلین کو گرفتار کرا کے دربار میں طلب کیا۔ ان سے اس سازش کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی تو سب نے اس کا انکار کیا۔ سلطان نے انھیں آگ سے گذار کر ان کے سچے یا جھوٹے ہونے کو ثابت کرنا چاہا تو علماء و مشائخ نے اس طریقۂ تفتیش کی مخالفت کی اور سلطان اس سے باز آگئے۔ اس کے بعد انھوں نے قاضی جلال الدین کو بدایوں بھیج دیا اور دوسرے ملزمین کو دور دراز علاقوں میں جلا وطن کر دیا۔ دوسری جانب دربار میں سیدی مولا سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا اور یہ کوشش کی گئی کہ وہ جرم کا اقرار کریں، لیکن وہ برابر لاعلمی ظاہر کرتے رہے۔ آخر میں سلطان کے اشارے پر بعض حیدری قلندروں نے (جو اس وقت دربار میں موجود تھے) سیدی مولا کو استرے سے زخمی کرنا شروع کیا اور پھر شہزادہ ارکلی خاں (سلطان جلال الدین خلجی کے لڑکے) کی ہدایت پر فیل بانوں نے انھیں ہاتھیوں کے نیچے روند ڈالا۔ یہ سب تفصیلات ضیاء الدین برنی نے پیش کی ہیں[68]۔ بعض دوسرے مورخین (بالخصوص عصامی) کے

بیان کے مطابق سیدی مولا کے کچھ حاسدوں نے ارکلی خاں کو اپنا ہم نوا بنا کر ان پر بیجا تہمت لگائی اور انھیں گرفتار کرایا اور پھر سلطان کی اجازت کے بغیر انھیں سزائے موت دے دی گئی[۶۳] بہر حال اس واقعہ کی مختلف مآخذ میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سیدی مولا مذکورہ بالا سازش میں شریک تھے یا یہ کہ سلطان جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد سلطان بننے کے لیے انھوں نے اپنی منظوری دی تھی۔ اس طرح بغاوت یا اس کی سازش میں شرکت کے شابہ پر سیدی مولا کو بے رحمانہ طور پر سزائے موت دی گئی اور طرفہ تماشا یہ کہ جو اصل مجرم تھے انھیں محض جلا وطن کیا گیا۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے سلطان محمد تغلق کے عہد میں حکومت کے خلاف بغاوت، سلطان کی مخالفت و تنقید، انھیں ظالم کہنے، ان کے منصوبوں سے اختلاف، کسی باغی امیر کی تعریف و تحسین اور اس کے لیے دعا کرنے کے جرم میں متعدد افراد (جن میں علما، و مشائخ بھی شامل تھے) کے قتل کیے جانے کے واقعات بیان کیے ہیں[۶۴] اگرچہ دوسرے تاریخی آخذ ان میں سے بیشتر واقعات کے ذکر سے خاموش ہیں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے دور میں شاہی خاندان کی ایک خاتون خداوند زادہ اور ان کے شوہر خسرو ملک نے سلطان کو قتل کرانے اور ان کی جگہ اپنے لڑکے کو سلطان بنانے کا منصوبہ بنایا لیکن اس کے روبہ عمل آنے سے قبل سلطان کو اس کا علم ہو گیا۔ سلطان نے سزا کے طور پر خداوند زادہ کو درباری زندگی سے علٰحدہ کر کے تنہائی میں محصور کر دیا اور ان کی ساری جائداد ضبط کر لی۔ البتہ ان کے گذارے کے لیے سالانہ وظیفہ مقرر کیا خسرو ملک کو محض جلا وطنی کی سزا دی گئی[۶۵] اگرچہ عہد سلطنت میں سیاسی جرائم کے سلسلہ میں جلا وطنی اور بعض دوسری ہلکی سزاؤں کے واقعات بھی ملتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں سیاسی مجرمین عام طور پر سزائے موت سے دوچار ہوتے تھے۔ اہم بات یہ کہ سلاطینِ دہلی اس باب میں اپنے اقدامات کو صحیح قرار دیتے تھے اور اس کے لیے بغاوت کے واقعات کی کثرت اور انتشار پسندوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا سہارا لیتے تھے۔ سلطان محمد بن تغلق کے استفسار پر ضیاء الدین برنی نے سزائے موت کے بارے میں قدیم بادشاہوں کے طرز عمل اور شریعت کے موقف کو تفصیل سے واضح کیا تھا۔ ان کی باتوں کو سننے کے بعد سلطان نے یہ فرمایا

تھا کہ میرے زمانہ میں حالات بہت سنگین ہو گئے ہیں ۔مفسدوں و شرپسندوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے اور بغاوت کے واقعات کثرت سے پیش آنے لگے ہیں، اس لیے میں تو بغاوت اور انتشار پیدا کرنے کے شبہ ہی پر لوگوں کو قتل کی سزا دیتا ہوں تا کہ شرپسند عناصر کی سرگرمیوں کو روکا جا سکے[۶۶] لیکن ان سب کے باوجود سیاسی مجرمین کو سزا دینے میں سلاطین سے جو بے اعتدالی اور احکام شریعت کی خلاف ورزی ہوتی رہی اسے کسی بھی صورت میں صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ شریعت کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ محض شبہ کی بنیاد پر حکومت کے خلاف بغاوت یا سازش کے جرم میں کسی کو سزائے موت دی جائے ۔ اسی طرح شریعت کی رو سے یہ بھی جائز نہیں کہ کسی مجرم (خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرم کا مرتکب کیوں نہ ہو) کو سزائے موت دینے کے لیے بے رحمانہ طریقے (مثلاً اوپر سے نیچے گرا دینا، پانی میں ڈبو دینا، جانور کے پیر سے کچلوانا، مسلسل بھوکا پیاسا رکھنا، حلق میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا، اعضا کو قطع و برید کرنا) اختیار کیے جائیں۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سلاطین دہلی مظلوموں کی دادرسی کے سلسلے میں بہت حساس تھے اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے ۔ اس لیے کہ وہ عدل و انصاف کے قیام کو حکمراں کی بنیادی ذمہ داری تصور کرتے تھے ۔ اسی نقطۂ نظر سے وہ مجرمین کو سزا دینے میں کسی رو رعایت یا نرمی سے کام نہ لیتے اور سخت ترین سزاؤں کے نفاذ میں بھی وہ اپنے و بیگانے، شاہی خاندان اور عام لوگ، درباری و غیر درباری میں کوئی تمیز نہ کرتے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجرموں کو سزا دینے میں ان کے فیصلے و اقدامات ہمیشہ شریعت کے مطابق نہ ہوتے، تاہم اس باب میں علماء سے مشورہ اور قاضیوں و مفتیوں سے استفسار اُس عہد کی مستحکم روایت تھی ۔ مزید برآں اوپر بہت سی ایسی مثالیں بیان کی گئی ہیں جو عہدِ سلطنت میں سزا کے سلسلے میں قانونِ شریعت کی پیروی ظاہر کرتی ہیں مورخین کے بیانات سے سب سے اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ مجرمین کو ضرور سزا ملتی تھی، دوسرے یہ کہ اس دور میں جرائم کے واقعات کی چھان بین اور مقدمات کی تفتیش کا ایک مرتب نظام تھا اور ملزم کو اپنے دفاع کا پورا حق حاصل تھا ۔ ان

باتوں کو یقینی بنانے کے لیے دیوان القضاء کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم تھا جس کی تفصیلات میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں[۶۵]۔ اوپر کے مباحث سے یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ عہدِ زیرِ بحث میں سزا کے باب میں (خاص طور سے سیاسی مجرمین کے معاملات میں) احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کے بھی بہت سے واقعات پیش آئے۔ اس قسم کے مختلف معاملات میں معاصر علماء وفقہاء نے سلاطین کو متنبہ بھی کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور کے حکمرانوں کے یہاں سیاسی جرائم کے مقدمات کی شنوائی وفیصلہ میں وہ احتیاط اور اصول وضوابط کی وہ پابندی نظر نہیں آتی جو دوسرے جرائم سے متعلق ملتی ہے۔ سیاسی مجرمین کو سزائے موت دینے کے لیے جو اذیت ناک طریقے اختیار کیے جاتے تھے ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں شرعی حدود وقیود کی رعایت ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی۔ ان سب باتوں کے ساتھ اُس عہد کے سلاطین اس نقطۂ نظر سے قابلِ تحسین ولائقِ تعریف ہیں کہ وہ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ کسی جرم میں ماخوذ ہونے کی صورت میں قاضی کی عدالت میں حاضر ہونے میں کوئی تکلف نہیں محسوس کرتے بلکہ ایک عام ملزم کی حیثیت سے اپنے آپ کو قاضی کے روبرو پیش کرتے تھے اور عدالت سے جو کچھ فیصلہ صادر ہوتا اسے بلاچوں چرا قبول کرتے، اس سے اہم بات یہ کہ مدعی اگر غیر مسلم ہوتا تب بھی وہ یہی روش اختیار کرتے۔ آج کے اس جمہوری دور میں مسلم بادشاہوں کا یہ طرزِ عمل موجودہ حکمرانوں کے لیے وجہِ عبرت ولائقِ اتباع ہے۔

حواشی ومراجع

۱ه فخر مدبر، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، لندن، ۱۹۲۷ء، ص ۳۳

۲ه حسن نظامی، تاج المآثر، نقل ۹۴-۹۶ (مخطوطہ آصفیہ لائبریری، حیدرآباد) ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ۲۳۹

۳ه رحلہ ابن بطوطہ، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۴ء، ص ۴۲۲

۴ه ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۴۰

۵ھ برنی، تاریخ فیروزشاہی، ص ۱۹۳

۶ھ حوالہ مذکور، ص ۲۹۵

۷ھ حوالہ مذکور، ص ۴۴۳

۸ھ رحلہ ابن بطوطہ، ص ۴۶۸

۹ھ حوالہ مذکور، ص ۴۶۸

۱۰ھ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروزشاہی، کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۵۰۳، ۵۰۸

۱۱ھ فتوحات فیروزشاہی (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) علی گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۳-۴۔ عین الدین ماہرو، علی گڑھ (بدون تاریخ) ص ۵-۶

۱۲ھ J. M. Banerjee, History of Firuzshah Tughlaq, Delhi, 1967 P. 70

۱۳ھ برنی تاریخ فیروزشاہی، ص ۲۹۲

۱۴ھ یحییٰ سہرندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ص ۱۱۵

۱۵ھ برنی، تاریخ فیروزشاہی، ص ۵۱۰ - ۵۱۱

۱۶ھ فتوحات فیروزشاہی، ص ۱۰

۱۷ھ برنی، تاریخ فیروزشاہی، ص ۲۲۲-۲۲۳

۱۸ھ حوالہ مذکور، ص ۲۸۵ - ۲۸۶

۱۹ھ حوالہ مذکور، ص ۴۲۳

۲۰ھ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (عربی متن مع اردو ترجمہ در: خورشید احمد فارق۔ تاریخ ہند پر ایک نئی روشنی، عربی کی ایک قلمی کتاب سے۔ ندوۃ المصنفین، دہلی (بدون تاریخ) ص ۴

۲۱ھ حوالہ مذکور، ص ۲۳-۲۴

۲۲ھ حوالہ مذکور، ص ۲

۲۳ھ Muhammad Habib & Afsar Umar Salim Khan, The Politikal Theory of the Delhi Sultanate (Eng. Tr. of Ziauddin Barani's Fatawa-i-Jahandari) Kitab Mahal Allahabad (Undated) P. VIII (Introduction)

۲۴ھ برنی، تاریخ فیروزشاہی، ص ۲۹۶

۲۵ه رحلہ ابن بطوطہ، ص ۴۷۱

۲۶ه رئیس احمد جعفری ندوی، سفرنامہ ابن بطوطہ (اردو ترجمہ رحلہ ابن بطوطہ) نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۱ء
ص ۶۰۹، حاشیہ ۱

۲۷ه انشاء ماہرو، ص ۱۶

۲۸ه تاریخ فرشتہ، مطبع نولکشور، ۱۲۸۱ھ، ۱/ ۳۰۳

۲۹ه برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۲

۳۰ه Muhammad Habib, op. cit. P. VII

۳۱ه تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مجیب اللہ ندوی، اسلامی فقہ، حصہ دوم، تاج کمپنی، دہلی
۱۹۹۶ء، ص ۱۰۷-۱۱۶

۳۲ه برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۴

۳۳ه حوالہ مذکور، ص ۵۱۰

۳۴ه عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۰۳-۵۰۸

۳۵ه برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۰، تاریخ فرشتہ ۱/ ۷۵-۷۶

۳۶ه تاریخ فرشتہ ۱/ ۷۶

۳۷ه رحلہ ابن بطوطہ، ص ۴۶۸

۳۸ه عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۰۳-۵۰۴

۳۹ه حوالہ مذکور، ص ۵۰۶، ۵۰۹

۴۰ه حوالہ مذکور، ص ۵۰۴-۵۰۹

۴۱ه برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۲

۴۲ه عفیف، تاریخ فیروز شاہی ص ۹۹، فتوحات فیروز شاہی ص ۶

۴۳ه عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۷۴-۴۹۲

۴۴ه حوالہ مذکور، ص ۴۷۲

۴۵ه عفیف، تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷۲

۴۶ه امیر خسرو، خزائن الفتوح، کلکتہ، ۱۹۵۳ء ص ۲۱، برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۳۶

۴۷ه تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات،

ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۸۱ء ص ۲۴۷،۲۴۹

۴۸ انتا دماہرو، ص ۱۶

۴۹ فتوحات فیروز شاہی، ص ۷ ، سیرت فیروز شاہی، ص ۱۲۶

۵۰ حوالۂ مذکور، ص ۷-۸

۵۱ حوالۂ مذکور، ص ۷

۵۲ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۲۵-۴۲۶

۵۳ فتوحات فیروز شاہی، ص ۸

۵۴ فتوحات فیروز شاہی، ص ۶، سیرت فیروز شاہی، ص ۱۲۸-۱۳۲، ۱۴۵، نیز دیکھئے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۲۴-۴۲۵

۵۵ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۹-۳۸۲

۵۶ الہدایہ جلد دوم (کتاب المرتد) ص ۵۷۷، ابن رشد، بدایۃ المجتہد، مکتبۃ الازہر مصر ۱۹۶۶ء، ۲/۴۹۸

۵۷ شیخ جمالی، سیر العارفین، دہلی، ۱۳۱۱ھ ص ۱۵۹

۵۸ حوالۂ مذکور، ص ۱۶۰، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۲۷

۵۹ برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۸، فتوحات فیروز شاہی، ص ۲

۶۰ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۵۳

۶۱ رحلہ ابن بطوطہ، ص ۴۷۸

۶۲ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۱۲، نیز دیکھئے یحیٰی سہرندی، تاریخ مبارک شاہی، ص ۶۵-۶۷، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۲۰۷-۲۱۱

۶۳ عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص ۲۱۶

۶۴ رحلہ ابن بطوطہ، ص ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۷، ۴۷۸-۴۸۱، ۴۸۳-۴۸۲

۶۵ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۰۴-۱۰۵، اس واقعہ کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: Banerjee, op. cit: PP. 23, 96

۶۶ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۱۰-۵۱۱

۶۷ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

M. BASHIR AHMAD, *THE ADMINISTRATION OF JUSTICE IN MEDIEVAL INDIA*, ALIGARH, 1941, (Chapts. III & IV, PP. 96-175).